محمد ناصر آفریدی
اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، سرحد یونیورسٹی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور
ڈاکٹر تحسین بی بی
صدر شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف صوابی، خیبر پختونخوا
ڈاکٹر رخسانہ بلوچ
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

علامہ اقبال کا تصوّرِ خودی اور مقاصدِ زندگی

Muhammad Nasir Afridi
Scholar PhD Urdu, Sarhad University Science & Technology, Peshwar.
Dr.Tahseen Bibi
Head of Urdu Department, University of Sawabi, KPK.
Dr. Rukhsana Baloch
Assistant Professor, Govt College Women University, Faisalabad

Allama Iqbal's Concept of the Self and Objectives of Life

Most important point of Iqbal's idea of 'Khudi' self-recognition is the obedience of God Almighty through which one can get the closeness of God and it has become the party of his personality.Through this man can get the higher aims of power of work and continuous effort.He is able to fight against time and environment.He can save himself from social evils.Iqbal's idea of self-recogntion is a type of measurement scale through which he wll be successful to get the targeted result.This article is going to represent the same idea and thought.

Key Words: *Self Recognition, Obedience, Aims, Enviroment, Goals.*

ہر جدت پسند شاعر اپنے نتائجِ فکر کے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی نیا اسلوب بیان تلاش کرتا ہے ۔ اس لیے اقبالؔ نے بھی انسان کی شخصی تعین یا عرفانِ نفس کے لیے "خودی" کا لفظ ڈھونڈ نکالا ہے اور اپنے افکار کی بلند عمارت اس نئے مفہوم پر استوار کی کہ جس نے "خودی" کے لفظ کو آراستہ کیا تھا۔ تو اسی میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہ تھی جن کو "خودی" کے اس نئے معانی سے اتفاق نہیں تھا۔ حکیم احمد شجاع "اقبالؔ کے نظریہ خودی کا صحیح مفہوم" میں لکھتے ہیں کہ:

"مجھے یاد ہے کہ قریب قریب ہر روز ایسے لوگ اقبالؔ کے اِرد گرد جمع ہوتے تھے جو اقبالؔ کے اس نظریے کو تو پسند کرتے تھے جس کے اظہار کے لیے اس نے "خودی" کا لفظ تلاش کر لیا تھا۔ مگر جو خودی کے لفظ کو اس نئے نظریے کے اظہار کے لیے پسند نہیں کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے "خودی" کی جگہ خود اعتمادی، خودداری، خودشناسی جیسے الفاظ بھی تجویز کیے۔ مگر اقبالؔ کو خودی کا لفظ کچھ ایسا پسند آ گیا تھا کہ اُس نے اس کو ترک نہ کیا"۔[۱]

اگرچہ اقبالؔ نے ان تمام اختلافات کے باوجود اس لفظ کو ترک نہ کیا لیکن "خودی" کے اس لفظ کا مقصد انھوں نے اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں واضح کر دیا کہ خودی کے لفظ کو انھوں نے کس خاص انداز میں استعمال کیا ہے۔ یہ ایسا رنگ ہے جو اس رنگ سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر "خودی" کے لفظ پر چڑھا ہوا ہے۔ اُنھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ "خودی" کا مقصد نہ تو غرور ہے اور نہ ہی انا ہے۔ کیونکہ غرور کی بنیاد فقدانِ تمینِ ذات پر ہے اور نہ ہی اپنی استعداد سے کسی بالاتر مدعا کے حصول ہی کی آرزو ہے، کیونکہ یہ چیز احساسِ نفس کے متضاد اور مخالف ہے۔ اقبالؔ کی خودی عمل کا پیغام دیتی ہے۔ اقبال کی خودی انسان کو اپنی قوتوں سے آگاہ کرتی ہے۔ جب یہ خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں تو وہ اپنا میدانِ عمل خود تلاش کر لیتی ہے۔ یہی زندگی کا مقصد اقبالؔ کے نزدیک زندگی اور اس کے حصول کی کوشش زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان الفاظ کا اظہار انھوں نے اپنی نظم "طلوعِ اسلام" میں یوں کیا ہے کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے [۲]

خالقِ کائنات نے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف جوہر ذات عطا کیا ہے۔ طبائع سے شخصیت تک انسانی اختلاف اور رنگا رنگی اتنا پھیلاؤ رکھتے ہیں کہ روزِ ازل سے آج تک کوئی دو انسان ایسے نہیں گزرے جن کے انگوٹھوں کے نشان ایک سے رہے ہوں۔ اس خالقِ حکیم کی بخشی ہوئی اس بوقلمونی نے ہر کسی کو ایک خاص صلاحیت، خاص توفیق اور خاص جوہر سے نوازا، اسی جوہر کی پہچان خودشناسی ہے۔ اس جوہر کو ترقی دینا گویا اپنی پوری توفیق اور تمام صلاحیت کار کو بروئے کار لے آتا ہے، تو اقبالؔ کا تصورِ خودی اسی جوہر کی تربیت اور پھر اس کے غور پر زور دیتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین کہتے ہیں کہ:

"خودی کا تصور اقبالؔ کے فلسفہِ حیات و کائنات کی بنیاد ہے"۔[۳]

اقبالؔ نے جس خودی کا تصور پیش کیا ہے وہ انسانوں کی انفرادی انا کی خودی ہی نہیں بل کہ خدا کی خودی ہے۔ خودی کے ذریعے انسان کو اپنی پہچان ہو جاتی ہے۔ جب انسان کو اپنی پہچان ہو جاتی ہے تو اُسے خدا کی پہچان ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسان کے اندر خودی ہونا ضروری ہے۔ خودی کے بغیر انسان مردہ تصور کیا جاتا ہے اور جس میں خودی نہیں ہے وہ غلام ہے اور اُسے خدا کی پہچان بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اقبالؔ نے خودی کا تصور دیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے مسلمانوں میں "خودی" کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ مسلمان قوم اس پستی اور غیروں کی غلامی سے نجات حاصل کر سکے۔ اس لیے دوسرے صوفیا کی نسبت اقبال نے وحدت الوجود کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مختلف ہے:

> "ہستی مطلق کی ماہیت خودی ہے۔ "ماسوا" اس کے اظہار ذات کے لیے ضروری ہے لیکن ماسوا بھی خدا کے سوا کچھ نہیں"۔[۴]

اقبالؔ کہتے ہیں کہ خود، خدا کی ماہیت خودی ہے اور خودی کی ماہیت یہ ہے کہ مقصد آفرینی اور مقصد کوشی۔ انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرے یہی خودی ہے اور یہی خودی کی ماہیت ہے۔

اقبالؔ نے خودی کے حصول کے لیے مراحلِ تربیت تشکیل دیے ہیں کہ جن پر عمل پیرا ہو کر انسان خودی حاصل کر سکتا ہے۔ اقبالؔ نے خودی کی تربیت کے مراحل بھی بتا دیئے ہیں، اقبالؔ کے نزدیک خودی کی تربیت کا پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس اور تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی ہے۔

اقبالؔ نے اطاعت کو خودی کی پہلی منزل قرار دیا۔ اطاعت حقیقت میں عبودیت اور عبادت کا اصل اصول ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ "ہم نے اپنی مخلوق کو صرف عبادت کے فرائض انجام دینے کے لیے پیدا کیا ہے"۔ اس عبادت کی ظاہری شکل اطاعت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ نیابت الٰہی کے مرحلے کو حاصل کرنے والا انسان اطاعت کی منزل سے نہ ہو کر گزرے۔ انسان کی اسی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے فرض کی ادائیگی کو انسان کی زندگی کا حال سمجھ کر اقبالؔ کہتا ہے کہ:

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا[۵]

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اپنی آزادی کو قانون کے حدود کے اندر محدود کر دینے کا نام اقبالؔ کے نزدیک اطاعت ہے اور یہ ہی تعینِ ذات کی پہلی منزل ہے۔ قانون کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر "انا" کا احساس وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر انسان خودی کے محل تک پہنچ جاتا ہے۔ جو شخص اپنی انا کو قانون کی حدود سے آئین سے محدود نہ کرے وہ اپنے محل اور مقام سے واقف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زندگی کی غایت اور مقصد:

"حسن آزینی ہے اور یہ ایک اجتماعی عمل ہے"۔(۶)

اس طرح عمل نہ کرنے سے انسان اپنی ہی ذات کے ساتھ ظلم کرتا ہے۔ اس لیے اس دنیاوی نظام میں انسان کا اپنی استعداد کے مطابق کسی مقصد کو تلاش کر لینا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے قویٰ کو سرگرم عمل کر دینا اور پھر عمل کے میدان میں قوانین و ضوابط کی حدود کے اندر رہ کر اپنی "انا" کے مقام کو حاصل کر لینا خودی ہے۔ خودی یہ نہیں سکھاتی کہ انسان دوسروں کے محل اور مقام نہ پہچانے اور ضبطِ نظام سے بیگانہ ہو کر حفظ مراتب کا پاس نہ رکھے۔

آئین و قوانین کے اندر رہ کر اپنی خودی کے مقام کو پہچاننے کا جوہر انسان میں وہ سیرت پیدا کرتا ہے جو اقبالؔ کے نزدیک خودی کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دوسری منزل ہے، یہی دوسری منزل ضبط نفس کے نام سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ یہ سیرت انسان کو اس کے اپنے قویٰ پر غالب کر دیتی ہے اور اسے ہر فعل میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا سکھاتی ہے۔ جب انسان کے قویٰ اس سیرت کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو ان سے ایسا کوئی فعل صادر نہیں ہوتا جو آئین و ضوابط کی حدود سے باہر ہو:

"گویا ضبطِ نفس اگرچہ اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن اپنے جوہر کے لحاظ سے حد شناسی کی ایک دوسری مگر اس سے بہت ارفع صورت ہے"۔(۷)

اطاعت میں چونکہ دوسرے کے حکم کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ لیکن ضبطِ نفس میں انسان کی عقلِ سلیم خود ہی اپنے نفس پر حکمران ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک جو شخص اپنی خودی کا تعین ضبطِ نفس سے نہیں کرتا وہ خودی سے بے گانہ ہے۔ یہ خودی کی دوسری منزل ہے۔ جس سے گزر کر انسان نیابت الٰہی کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

نیابتِ الٰہی خودی کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہوتا ہے اور یہ ایک مشکل مقام ہوتا ہے۔ ایک ایسا مقام جہاں انسان "انا" کی لذتوں سے آشنا ہو کر بھی اپنے آپ کو عالم وجود کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں کر سکتا۔ اس لیے خودی

کی تربیت کے مراحل میں یہ ایک نازک مقام ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر انسان دنیا کی لذتوں، دنیا کے خوف سے یا مال و دولت جیسی توہمات میں گھر کر کہیں اپنی خودی نہ کھو بیٹھے۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
تورازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا (۸)

اقبالؔ کہتا ہے کہ انسان کی خودی اس کو مجبور کر دے کہ وہ اپنے قویٰ کو عمل کا خوگر بنائے۔ اس کا عمل نتائج سے بے نیاز ہو مگر اس کی یہ ہر نئی راہ آئین و ضوابط کی حدود کے اندر ہو۔ وہ اس لیے سرگرم رہے۔ وہ اس لیے سرگرم عمل رہے کہ اس کا عمل ہی اُس کی مزدوری ہے۔ اس کی یہ محنت کسی اعتراف کی محتاج نہیں۔ جس طرح سورج ہر روز روشنی اور حرارت پھیلاتا ہے مگر اس روشنی اور حرارت کو پھیلانے کی کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔

اقبالؔ کی خودی بھی نقطۂ نور ہے۔ جس سے زندگی روشنی اور حرارت پھیلاتی ہے۔ مگر اس کے لیے کوئی مزدوری نہیں چاہتی، کوئی انعام نہیں مانگتی۔ اس خودی کا رمز شناس ہی اقبالؔ کے نزدیک مردِ مومن ہے:

خودی کا سرنہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آ بجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں (۹)

اقبالؔ کے نزدیک انسان میں خودی کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں خودی نہیں وہ غلام اور کم زور ہو جاتا ہے اور اس خودی کو کم زور کرنے والے عوامل یہ ہیں کہ انسان دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرے اور اُسے اپنے آپ پر اعتماد بھی نہ رہے۔ اقبالؔ نے مسلمانوں کو خودی کا سبق اس لیے دیا تھا کہ مسلمان قوم پستی اور زبوں حالی کا شکار ہو چکی تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کل کا انتظار کر رہی تھی۔ "جواب شکوہ" میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟

میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینے سے لگایا کس نے؟
تھے وہ آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو (۱۰)

انسان کے اندر جب انقلابی اور فکر و عمل کی تبدیلیاں اور ان کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔بے عملی، غیر اسلامی تصوف، فقہی موشگافیاں، مفہوم سے زیادہ لغت پر زور دے، روایات کی پیروی اور دوسروں کی اندھی تقلید جیسے امراض جب انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کی خودی مر جاتی ہے۔ اقبالؔ نے اس لیے خودی پر زور دیا ہے تاکہ مسلمان قوم میں خودی بیدار ہو جائے۔بے عملی اور بے راہ وروں سے انسانی صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔دوسروں کی اندھی تقلید سے اپنی شخصیت اور انا کو کھو جانے کی وجہ سے خودی مردہ ہو جاتی ہے۔اس لیے اقبالؔ نے ان عوامل کی نشاندہی بھی کی ہے جو انسان میں ضعف اور کم زوری پیدا کر دیتے ہیں۔اس لیے ہمت اور حوصلے کی تلقین کرتے ہیں کہ کم ہمتی سے انسان غلامی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے مردہ جسم بنا دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے جو کہ سراسر خودی کے منافی ہے۔

قوتِ عمل کا فقدان اور حرکت کا فقدان ایسے عوامل ہیں کہ جن سے خودی مر جاتی ہے۔

اسی لیے اقبالؔ نے وحدت الوجود کے اُس عقیدے کی نفی کی جو بے عملی کا سبق دیا تھا اور جس کی وجہ سے انسان خودداری اور قوتِ عمل سے محروم ہو جاتا ہے:

"اسی محرومی کا علاج صرف یہ ہے کہ نفی خودی یعنی بے عملی کے اس فلسفے کا رد کیا جائے اور خودی کا احساس دلا کر اس میں سعی و عمل کی تازہ قوتیں پیدا کی جائیں"۔(۱۱)

اس لیے اقبالؔ نے ایسے عوامل کی نشاندہی کر دی جس سے خودی زائل ہوتی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری اور نثر میں ایسے عوامل سے منع کیا جس سے انسانی زندگی میں قوتِ عمل کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور مسلسل حرکت اور جدوجہد کا جوش ختم ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ نے اپنی پوری شاعری میں مسلمانوں کو قوتِ عمل کا درس دیا ہے اور شاہین جیسے بلند پرواز پرندے کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو بلند پروازی کا سبق دیا ہے۔چونکہ انسان جب اطاعت خداوندی کرتا

ہے اور اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے تو اس کے اندر ایک طاقت جنم لیتی ہے اس خودی بیدار ہو جاتی ہے۔ اُس میں عمل کرنے کا جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔

چناں چہ اقبال نے نفی وجود کے بجائے اثباتِ وجود کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے صوفیا کے نظریات کا جائزہ لے کر قرآن مجید کی روشنی میں اپنا نظریۂ خودی پیش کیا، جو قرآنی مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے۔ چونکہ کائنات میں سب سے اعلیٰ خودی انسان کی ہے، اسی لیے باقی اشیا کی نسبت انسان سے زیادہ قریب ہے۔ اسی لیے اقبال نے کہا کہ:

"اگر انسان خدا کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو اُسے اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہیے۔ جب وہ اپنی خودی کو پالے گا تو خدا سے خود بخود مل جائے گا"۔ (۱۲)

عمل کو شدت بخشنے والی سب سے بڑی قوت عشق ہے۔ یہ عمل کو تسلسل عطا کرتی ہے اور نصب العین سے محبت سکھاتی ہے۔ عشق اپنے نصب العین کے حصول کے لیے کسی خطرے سے نہیں ڈرتا۔ یوں یہ عمل کو بے خوف بنا دیتا ہے اور تمام اندیشوں کو راہ سے ہٹا دیتا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش غرور میں عشق
عقل محوِ تماشائے لب بام ابھی (۱۳)

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اپنے ہی ماحول سے سرگرم پیکار رہنے اور اپنی غور اور افزائش میں سرگرم عمل رہنے سے تخلیقی عوامل کے ہاتھوں خودی کو انفرادیت حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ یہ وجدان کو بروئے کار عمل رکھتے ہوئے فعال اور مؤثر قدم اٹھائے اور اپنے مخالف محرکات ماحول پر اپنی تشخیص ذاتی کی گہری چھاپ لگائی جائے۔ گویا ماحول کے صرف خودی کا حقیقی جہاد اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ جہاد رومانی سطح پر ہو۔ اقبالؔ کے یہاں قوتِ عمل ایک ایسا جذبہ ہے جو خودی کو پروان چڑھاتا ہے اور قوتِ جوش عشق ہے۔ یہ عشق در حقیقت اپنی ماہیت اور فطرت کے اعتبار سے خودی اور کائنات کے برابر ایک وجود ہے:

"جس پر تمام کائنات کی اساس ہے۔ اور یہی عشق انسان کی خودی کو اس کی ارفع ترین بلندیوں تک پہنچا کر خدا کی نیابت سے مشرف کرتا ہے"۔ (۱۴)

خودی میں پیکار کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نظریے کے مطابق دہر اخلاق ایک شمشیر کی مانند ہے۔ جو خود اپنا راستہ بناتی ہے اور ہر قسم کی مزاحمتوں کو اپنے راستے سے ہٹاتی چلی جاتی ہے۔ دہر کی ارتقائی اور خلاقی

قوت کبھی تو حکیم کے اندر کار فرما ہوتی ہے اور کبھی حیدر کرار کے پنجہ گیر میں کار فرما ہوتی ہے۔ اس زمانِ حقیقی میں دوش فردا نہیں ہوتے اور نہ ہی انقلاب روز و شب ہوتے ہیں۔ انسان نے زمان کو مکان پر قیاس کر لیا ہے اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ ایک لاشناہی لکیر ہے جو ازل سے ابد تک کھینچی ہوئی ہے۔ ناسمجھ انسان وقت کو لیل و نہار کے پیمانوں سے ناپتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح خدا کا وقت ہمارا وقت نہیں اسی طرح خودی میں ڈوب کر زندگی سے آگاہ ہونے اور زندگی کی قوتوں کو وسعت دینے والے انسان کا وقت بھی، ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم شدہ ہے۔ زندگی وقت میں نہیں گزرتی بل کہ وقت تو زندگی کی ایک تخلیقی قوت ہے۔ زندگی جب مردہ ہو جاتی ہے تو وہ صبح و شام کا کفن پہن لیتی ہے اور انسان افسوس کرتا ہے کہ:

"عمر گراں مایہ کے اتنے ایام گزر گئے اور گردشِ ایام مجھے موت کے قریب لے جا رہی ہے"۔(۱۵)

انسانی زندگی کے مقاصد ہوتے ہیں۔ مقصد کے ذریعے انسان اپنی سعی اور عمل کی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ ایک دُور سے نظر آنے والی روشنی ہے۔ جس کی طرف ہم جاتے ہیں۔ یہ منزل ہمارے آگے ہوتی ہے نہ کہ ہمارے پیچھے۔ ماضی کے جبر کی جگہ ہم اس میں مستقبل کی آزادیوں کا دلکش منظر دیکھتے ہیں۔ ان مقاصد کی بدولت زندگی کا مرکزِ ثقل مستقبل کی جانب جُھک جاتا ہے۔ آج جو عالم طبعی ہمارے سامنے ہے وہ کل کے عالم طبعی کی پیداوار ہے۔ لیکن آج کا عالم اخلاقی کل کے آنے والے عالمِ اخلاقی کے لیے ایک تیاری ہے۔ فطرت میں چونکہ ارتقا کا عمل خارجی ہے، اس لیے فطرت خود انفعالی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اقبالؔ نے رہبانیت والے تصوف کی مخالفت کی ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی ہے، کیونکہ اس میں پیکار نہیں ہے، اس لیے یہ عمل کا درس دیتا ہے:

"اقبالؔ کا تصوف پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عمل سے گریز سکھاتا ہے"۔(۱۶)

ایک سچا مومن کسی دنیاوی خوف و خطر کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا ہے۔ وہ صرف خدا سے ڈرتا ہے۔ جو جملہ کائنات کا مالک ہے اور توحید کی حقیقی روح کو بجنول جانتا ہے اور سمجھتا ہے۔ یہ روح عملاً مساوات، اتحاد اور "حریت" پر مشتمل ہے۔ یہ فرد میں قوت، ہمت اور عزت نفس کی ایک نئی روح پھونک دیتی ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک ایمان اور توحید کی پیکار فرد کی زندگی کو قویٰ، جان دار اور پاکیزہ بنا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ تمام خوف و خطر کو سوائے خوفِ خدا کے حقیر سمجھنے اور ایک ناقابلِ شکست جرات رکھنے کی بدولت انسان کا دل رحمٰن کا مسکن بن جاتا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک:

"کائنات کو کام میں لانے کے اس دیرانہ طریقے کو ہی قرآن "ایمان" کہتا ہے"۔[۱۷]

اور یہی ایمان انسانی خودی ہے کہ جس کے ذریعے انسان اعلیٰ مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ خودی ہی کی پیکار ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک اس کائنات:

"عالم کا ذرہ خود شناسی میں سرشار ہے"۔[۱۸]

حوالہ جات

۱۔ گوہر نوشاہی، مرتب: مطالعۂ اقبالؔ، بزمِ اقبال، لاہور، دوم ۱۹۸۳ء، ص ۲۱۰

۲۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، بانگِ درا، بک کارنر، جہلم، س ن، ص ۳۲۷

۳۔ احسان اکبر، پروفیسر، ڈاکٹر، اقبال کا تصورِ خودی، مشمولہ: علامہ اقبال کا خصوصی مطالعہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، اول ۲۰۰۱ء، ص ۲۲

۴۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ہشتم، ۲۰۰۵ء، ص ۳۴۴

۵۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، بانگِ درا، بک کارنر، جہلم، س ن، ص ۳۲۶

۶۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، مطالعۂ اقبال کے چند نئے رُخ، بزمِ اقبال، لاہور، دوم ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۶

۷۔ حکیم احمد شجاع، اقبال کے نظریۂ خودی کا صحیح مفہوم، گوہر نوشاہی، مرتب: مطالعۂ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، دوم ۱۹۸۳ء، ص ۲۱۹

۸۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، بانگِ درا، بک کارنر، جہلم، س ن، ص ۳۲۵۔۳۲۶

۹۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، بالِ جبریل، نیاز جہانگیر بک، پرنٹرز، لاہور، س ن، ص ۳۹

۱۰۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، بانگِ درا، بک کارنر، جہلم، س ن، ص ۲۵۰

۱۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۹۱

۱۲۔ حسن اختر، ملک، ڈاکٹر، اظراف اقبال، بزم اقبال، لاہور، دوم ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۸

۱۳۔ محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، بانگِ درا، بک کارنر، جہلم، س ن، ص ۲۶۱

۱۴۔ قیصر الاسلام، قاضی، فلسفے کے بنیادی مسائل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، پنجم ۲۰۰۰ء ص ۵۴۲

۱۵۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، بزمِ اقبال، لاہور، ہشتم، ۲۰۰۵، ص ۳۵۷

۱۶۔ یوسف حسین، خان، ڈاکٹر، روحِ اقبال، القمر انٹرپرائزز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۷

۱۷ ضیاءالدین، احمد، پروفیسر، اقبال کا فن اور فلسفہ، بزمِ اقبال، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۸

۱۸۔ طاہر فاروقی، پروفیسر، ڈاکٹر، سیرت اقبال، گوہر پبلشرز، س ن، ص ۲۷۱